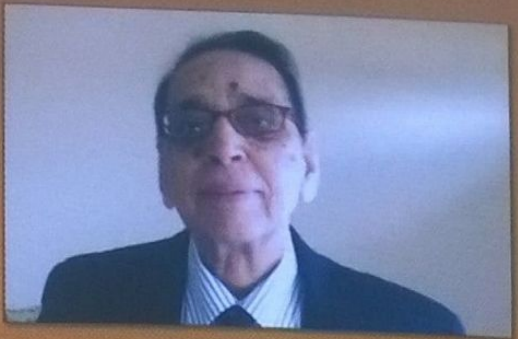
اوراق خزانی

احمد مشتاق



احمد مشتاق ایک ایسے شاعر کا نام ہے جس کے تعلق سے اردو تنقید نے کافی Confusion پھیلا رکھا ہے جس کے نتیجے میں احمد مشتاق کو بھی اچھی خاصی شہرت ملی اور احمد مشتاق کے حامی اور مخالف دو طرح کے نقادوں کو اپنی بھڑاس نکالنے کا موقع بھی ملا۔ کہیں تو احمد مشتاق کو میر کا دام ہم رنگ زمین قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے کہیں انیس، فراق سے بہتر شاعر قرار دیا جاتا رہا۔ مگر اس سے ان کی شاعری کے ساتھ انصاف نہیں ہو پاتا اس ساری بحث کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ احمد مشتاق ہیں کیا؟ اُن کی شاعری کا اصلی جوہر کیا ہے؟ کن جہتوں میں وہ اپنے ہم عصر یا پیش رو شاعروں سے مختلف ہیں اور کن جہتوں میں بہتر ہیں اپنے بعد کی آنے والی نسلوں کے لیے اُن کے پاس کیا ہے؟ احمد مشتاق کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے اندر دو ایسی متضاد صفات بیک وقت پائی جاتی ہیں جن کا کسی ایک وجود میں جمع ہو جانا کسی کرشمے سے کم نہیں ہے۔ ایک طرف وہ اتنی عام سی بات پہ شعر کہہ جاتے ہیں کہ جس پر کسی حساس سے حساس شخص کی بھی نظریں نہیں ٹھہرتیں اور دوسری طرف اتنی گہرائی میں بھی اتر جاتے ہیں جہاں تک پہنچنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی اور یہ چیز احمد مشتاق کو ایک بہتر اور منفرد شاعر بناتی ہے۔ مثال کے طور پر احمد مشتاق کے ان اشعار کو دیکھیے:

بہت اداس ہو تم اور میں بھی بیٹھا ہوں
گئے دنوں کی کمر سے کمر لگائے ہوئے

جدا ہوئے تو کئی رنگ تھے خیالوں میں
ملے تو ایک ہے پانی کا رنگ پیاس کا رنگ

ان شعروں میں احمد مشتاق جتنی
گہرائی میں اترے ہیں شاید ہی ان کے ہم
عصروں میں کسی کے لیے یہ آسان ہو۔ اب
احمد مشتاق کے یہ اشعار دیکھیں:

دل فسردہ تو ہوا دیکھ کے اس کو لیکن
عمر بھر کون جواں کون حسیں رہتا ہے

اب تک ہے وہی عالم دل کا وہی رنگ شفق وہی تیز ہوا
وہی سارا منظر جادو کا میرے نین سے نین ملائے ہوئے

اس جگہ احمد مشتاق نے جتنے
عام خیال کو شعر کے قالب میں
ڈھالا ہے وہ احمد مشتاق ہی کا خاصہ
ہے۔ احمد مشتاق کے ہاں عام اور آسان لفظوں
میں بڑے خیال کو اس طرح سمو دیا
جاتا ہے کہ خیال اور الفاظ کا توازن برقرار
رہتا ہے۔ نہ ہی لفظ خیال پہ بھاری پڑتا
دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی خیال لفظ پر
غالب آتا ہے۔

احمد مشتاق الفاظ کو خیال کے Delivery
Boy کی طرح استعمال نہیں کرتے بلکہ الفاظ کے
تقدس کو برقرار رکھتے ہیں۔ مثال کے
طور پہ احمد مشتاق کے یہ شعر ملاحظہ
فرمائیں:

اب اس کی شکل بھی مشکل سے یاد آتی ہے
وہ جس کے نام سے ہوتے نہ تھے جدا مرے لب

میں کبھی یہ حرف نہ بولتا میں کبھی یہ راز نہ کھولتا
تیری آنکھ نے دیا حوصلہ تو یہ بوجھ اِدھر سے اُدھر کیا

اردو کے اس اہم اور منفرد لب و لہجے کے
شاعر کا شعری مجموعہ شائع کرتے
ہوئے ریختہ فخر محسوس کرتا ہے۔

(ریختہ فاؤنڈیشن)

اوراق خزانی

احمد مشتاق

Auraq-e-Khizani

By : Ahmad Mushtaq

Ist Edition : 2015

ISBN:978-81-926648-1-1

Rs : 250/-

اوراقِ خزانی	:	احمد مشتاق
سالِ اشاعت	:	۲۰۱۵
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۲۵۰/روپے
ناشر	:	ریختہ فاؤنڈیشن

فہرست

کچھ لکھا ہے تجھے ہر برگ پہ اے رشکِ بہار

میرؔ

احمد مشتاق کی شاعری

ادب اور آرٹ بعض اوقات ہماری اس زندگی کی بحالی کا ذریعہ بن جاتے ہیں جن سے تاریخ کی سرد مہری اور عجلت پسندی کے باعث ہم اکثر بے نیاز اور دور رہ جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کچھ لکھنے والے ہمارے لیے ایک خاص اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ احمد مشتاق کا شمار میں اپنے ایسے ہی معاصرین میں کرتا ہوں۔ ان کی کوئی تحریر سامنے آتی ہے، ترجمے کی وساطت سے یا اشعار کی صورت میں، تو لگتا ہے کہ کسی ایسے دوست سے ملاقات ہو رہی ہے جسے ہم بھلائے بیٹھے تھے۔ اپنی روزمرہ کی زندگی کی متین افسردگی اور آہستہ روی کے باوجود، احمد مشتاق ذہنی اور تخلیقی لحاظ سے بہت توانا اور سرگرم ہیں۔ خرابی بس یہ ہے کہ وہ اپنے

آپ سے بے نیازی کے عادی ہو چلے ہیں۔ شعر کہتے بھی ہیں تو انہیں چھپوانے کی فکر نہیں کرتے۔ ترجمہ کرتے ہیں تو اس کی نوک پلک درست کرنے میں خاصا وقت لگ جاتا ہے، اپنے محاسبے کی یہ روش اور روایت ہمارے یہاں زیادہ عام نہیں ہے۔

تقریباً ساٹھ برسوں میں کل جمع دو سوا دو سو غزلیں، اس طرح احمد مشتاق کا ایک سال میں بہ مشکل چار غزلوں کا حساب بنتا ہے۔ دل ہی دل میں اسی دور کے اپنے دوسرے سب سے زیادہ پسندیدہ غزل گو ظفر اقبال سے احمد مشتاق کا موازنہ کرتا ہوں تو دونوں کی رفتار حیران کرتی ہے۔ ایک کی رفتار اپنی گرمی اور تیزی اور طباعی کی بنا پر، دوسرے کی رفتار اپنے دھیمے پن، ٹھہراؤ اور اپنی بے نیازانہ روش کے باعث۔

احمد مشتاق کے شعر کہنے اور زندگی گزارنے، دونوں کے انداز میں تال میل بہت ہے۔ ہیوسٹن (امریکہ) میں قیام ہے۔ پچیس برس پہلے لاہور چھوڑ کر وہاں جا بسے تھے۔ مگر ایسا نہیں کہ ٹی ہاؤس کی محفلوں کو یاد نہ کرتے ہوں۔ ان کے یاد کرنے کا بھی اپنا انداز ہے۔ جب چاہا فون کر لیا۔ اسی طرح کم سے کم ضرورتوں کے ساتھ بسر کرنا، لوگوں سے کم ملنا جلنا، آنا جانا، بس اپنی کتابوں میں اور اپنے خیالوں میں گم رہنا ان کا روز مرہ ہے۔

مہینے میں ایک دو بار ہماری بات چیت بھی ہو جاتی ہے لیکن احمد مشتاق کی آگہی، دنیا سے ان کا سروکار، اچھی کتابوں سے ان کا شغف غیر معمولی ہے۔ زندگی اور شاعری دونوں ہمیشہ ان کے قابو میں رہے۔

ان کے دوسرے مجموعے ''گرد مہتاب'' کی اشاعت کو بیس برس سے زیادہ کا عرصہ گزرا۔ ایک معروف نوجوان شاعر عاریتاً ان کی یہ کتاب مجھ سے لے گئے۔ رات بھر میں پوری کتاب نقل کر ڈالی۔ کہنے لگے کہ اپنے پسندیدہ اشعار یکجا کر رہا تھا۔ اسی رَو میں پوری کتاب اتار لی۔ یہ معاملہ شاید موجودہ دور یا اس سے پہلے کے دور کی کسی کتاب کے ساتھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اتنے منتخب شعر ہمارے زمانے میں کسی اور غزل گو نے نہیں کہے۔

احمد مشتاق کی غزل کا سب سے بڑا وصف، زبان و بیان کے ساتھ ساتھ ان کے طرز خیال اور ادراک کی نرمی، اعتدال اور جذبے یا تجربے کے اظہار میں ضبط کا احساس ہے۔ وہ بہت سوچ کر شعر کہتے ہیں، پھر بھی تفکر کا عمل ان کے یہاں کبھی نمایاں نہیں ہوتا۔ ایسی شائستہ فکری ہمارے دور اور اس دور کی شاعری، دونوں کے مزاج سے مختلف ہے اور اسی لیے احمد مشتاق کا شعر کسی خاص نہج کی فکر، تجربے اور رویے کا سہارا لیے بغیر، ہمارے احساسات سے ایک بے نام، بڑی حد تک

شخصی تعلق قائم کرلیتا ہے۔ حال کی تمام تر درہمی بھی ان کے کلام کو مجموعۂ پریشانی نہیں بننے دیتی۔

محبت میں زیادہ سوچنا اچھا نہیں ہوتا
زیادہ سوچنے سے وسوسے گھر دیکھ لیتے ہیں

رات باقی نہ چراغ رخ زیبا باقی
وہ زماں ہو کہ مکاں کچھ نہیں رہتا باقی

دستکوں کی صدائیں آتی ہیں
اور بیرون در نہیں کوئی

ان شعروں کا تعلق اجتماعی زندگی کے آشوب سے ہے یا یہ کسی نجی واردات سے پردہ اٹھاتے ہیں؟ یہ رمز احمد مشتاق کے شعروں میں کبھی نہیں کھلتا۔ وقت کو، یادوں کو، اپنے چاروں طرف بکھرے ہوئے تجربوں اور تماشوں کو، وہ اپنے اندر اس طرح جذب کرلیتے ہیں کہ کوئی بھی بات نہ تو صرف اپنی دنیا کی بات رہ جاتی ہے، نہ صرف

اپنے داخلی وجود کی۔

اب رات تھی اور گلی میں رکنا
اس وقت عجیب سا لگا تھا

بادل کی گرج ڈراؤنی تھی
چھاجوں پانی برس رہا تھا

چلو ایسا مکاں آباد کریں
جہاں لوگوں کی آوازیں نہ آئیں

ہاتھ کاغذ پہ دھرے بیٹھا ہوں
شعر آ آ کے پلٹ جاتے ہیں

انوکھی چمک اس کے چہرے پہ تھی
مجھے کیا خبر تھی کہ مر جائے گا

ان تمام شعروں میں بظاہر واقعات بیان کیے گئے ہیں، مگر اس طرح کہ ہر واقعہ ایک کیفیت میں منتقل ہوگیا ہے اور ہر بیان نے، بیرونی دنیا کے قصوں سے رابطوں کے باوجود، ایک کیفیت کا یا ایک سرگوشی کا سا انداز اختیار کرلیا ہے۔ لہٰذا ہر منظر سے دنیا تو غائب ہوجاتی ہے اور ہمارے سامنے صرف ایک اکیلے، مضمحل اور بے چین سے فرد کا سایہ رہ جاتا ہے۔ جی چاہے تو اس شخص کو احمد مشتاق کہہ لیجیے۔ ناصر کاظمی کے بعد اپنے احساسات سے اتنا گہرا سچا رشتہ ہمارے زمانے کے کسی دوسرے غزل گو نے قائم نہیں کیا۔

اسی طرح، احمد مشتاق کی شاعری میں رنگوں کا، رتوں کا، مناظر اور مظاہر کا بیان بہت ہے، جیسے اس عالم آب و گل کا ہر قریہ، ہر گوشہ دیکھنے والے کے لیے حیرت کدہ ہو، اور نت نئے خیالوں، واقعات اور تجربوں سے معمور، طرح طرح کی رونقوں سے آباد ایک شہر طلسمات ہو، جس میں جابجا کہانیاں بکھری ہوئی ہوں۔ لیکن ان سب کے اجتماع سے جو وحدت تعمیر ہوتی ہے، وہ بڑی خاموشی کے ساتھ دیکھنے والے کی آنکھ کے تل میں اتر آتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بغیر کسی تحریف اور تخفیف کے، احمد مشتاق کے شعروں میں بیان کی جانے والی ساری داستان، اداسی اور تنہائی کے ایک احساس میں

سمٹ آتی ہے۔ یہ ساری شاعری، شروع سے اخیر تک ایک انوکھا زندگی نامہ ہے جس کے مرکز سے ابھرنے والی تصویر اس فرد کی ہے جو دنیا کے معاملات میں مداخلت کے بغیر، ہر موسم، ہر واردات کو خاموشی سے قبول کر لینے کا عادی ہے۔

اس لیے حال دل نہیں کہتا
کہیں جذبات میں نہ بہہ جاؤں

دوپہر کے وقت ٹھنڈی گھاس پر لیٹا ہوا
صاف نیلے آسماں کو دیکھتا رہتا ہوں میں

یہ تماشا کسی جبر کا ہے یا اختیار کا، اس کا فیصلہ احمد مشتاق نے اپنے قاری کی بصیرت پر چھوڑ دیا ہے، بے رضا و رغبت ہماری زندگی اور یہ دنیا ایسی تو نہیں کہ اس کے لیے کسی فضول بحث میں پڑا جائے۔ احمد مشتاق کی شاعری بھی اسی لیے، ہم سے اپنے سمجھے جانے کا نہیں، بلکہ محسوس کیے جانے کا تقاضا کرتی ہے۔ یوں بھی یہ شاعری ہماری عام زندگی اور عام انسانوں کو پیش آنے والے جانے پہچانے رنگوں اور

تجربوں سے مالا مال ہے۔ نہ زبان وبیان اجنبی، نہ خیالات اور محسوسات اور واردات اجنبی۔

یہ ''اوراقِ خزانی'' احمد مشتاق کے غیر مطبوعہ کلام پر مشتمل ہیں۔ ان کی اشاعت پر بھی وہ بڑی مشکل سے آمادہ ہوئے۔ ان اشعار سے گزرتے ہوئے، نظر جا بجا ٹھہری اور انفرادی تجربوں، جذبوں اور خیالوں کے بہت انوکھے اور تازہ کار مظاہر کا سامنا ہوا۔ مانوس اور فرسودہ مضامین سے شغف کے اس دور میں احمد مشتاق کے یہ شعر اپنی ایک الگ پہچان اور مزہ رکھتے ہیں:

پہلے بھر دیتے ہیں سامان دو عالم دل میں
پھر کسی شے کی تمنا نہیں رہنے دیتے

دل نہ میلا کرو سوکھا نہیں سارا جنگل
ابھی اک جھنڈ سے پانی کی صدا آتی ہے

کیسی ناگن ہے یہ اداسی بھی
بھری محفل میں آکے ڈستی ہے

ارے کیوں ڈر رہے ہو جنگل سے
یہ کوئی آدمی کی بستی ہے

جو نہیں سنتے ہیں ان کو بھی سناؤ اپنی بات
جو نہیں ملتے ہیں ان سے بھی ملاقاتیں کرو
موت خاموشی ہے چپ رہنے سے چپ لگ جائے گی
زندگی آواز ہے باتیں کرو باتیں کرو

گلیوں کو چپ لگی ہے نگر بولتے نہیں
دیوار و در وہی ہیں مگر بولتے نہیں
اوّل تو بولتے ہی نہیں لوگ شہر کے
جو بولتے ہیں بارِ دگر بولتے نہیں

سائے بھی اس بہار و خزاں کے گزر گئے
اب کیا ہے دیکھنے کو وہاں کیا کروں گا میں
کیوں اس کی یاد کو بھی نہ دل سے نکال دوں
جب آگ بجھ گئی تو دھواں کیا کروں گا میں

یہ جو بھی ہو بہار نہیں ہے جناب من
کس وہم میں ہیں دیکھنے والے پڑے ہوئے
شیشے کے اک گلاس میں نرگس کے پھول ہیں
اک میز پر ہیں چند رسالے پڑے ہوئے

ہم گرے ہیں جو آکے اتنی دور
کس نے پھینکا گھما کے اتنی دور
لالہ و گل بھی اک تسلی ہے
کون آتا ہے جا کے اتنی دور

اس ریگ زار تن کا بکھرنا ہے ناگزیر
چاہے ہزار کوشش یک جائی کیجیے

یہ ترا طور سمجھ میں نہیں آیا مشتاق
کبھی ہنستے چلے جانا کبھی اتنا رونا

وہ کارِ عشق ہو یا کاروبارِ دنیا ہو
کوئی بھی کام نہ ہم نے کیا ٹھکانے سے

تم نے دیکھے نہیں خزاں کے رنگ
بھول جاتے بہار کے انداز

مدتیں ہوگئیں دیکھا ہی نہیں اس کی طرف
اسی ڈر سے کہیں بدلا نہ ہوا لگتا ہو

کس کے بندھے ہوئے تھے ہم دامنِ ماہتاب سے
ہم بھی ادھر گئے چاند جدھر جدھر گیا

آئینہ بھی بدل کے دیکھ لیا
وہی صورت دکھائے جاتا ہے

ہے روپ مگر کسی کسی پر
ہے دھوپ مگر کہیں کہیں ہے

اپنی بھی دوستی تھی چراغ نشاط سے
طاقِ شب ملال کبھی روشنی تھے ہم

اسے نئے در و دیوار بھی نہ روک سکے
وہ اک صدا جو پرانے مکاں سے آتی ہے

جہان تنگ دلاں کے ستم رسیدوں کو
دیار خواب میں آباد کرتا رہتا ہوں

یہی دنیا تھی مگر آج بھی یوں لگتا ہے
جیسے کاٹی ہوں ترے ہجر کی راتیں کہیں اور

لوگ پہلے ہی کون سے خوش ہیں
کیوں کسی کو خفا کرے کوئی

اسی چکر میں زمانے گزرے
دن چڑھا شام ہوئی رات آئی

صبح ہوتی نہیں دیکھی ہم نے
رات گزری تھی کہ پھر رات آئی

اب مجھ کو داد سارا زمانہ بھی دے تو کیا
جس کے لیے لکھا تھا اسی نے نہیں پڑھا

اتارے طاق نسیاں سے کئی گزرے ہوئے موسم
پھر ان کو طاق نسیاں پر اٹھا کر رکھ دیا ہم نے

یہ فکر تھی پہلے کہ سفر کیسے کٹے گا
اب سوچ رہے ہیں کہ بہت تیز چلے ہم

احمد مشتاق کی حیثیت اور شاعری کا سفر بہت تیز تو نہیں رہا، مگر ایک مختصر سے سفر میں اتنی منزلیں ان کے ہم عصروں نے کم ہی دریافت کی ہیں۔ ایسے ہی شعروں سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ خموشی بھی اک طرز اظہار ہے! ایسی شاعری کو غیر معمولی افکار یا زبان و بیان کے

کرتب درکار نہیں ہوتے۔ اس میں وہ جذباتی کشادگی، وہ اخلاقی تشویش اور وہ طاقت، توانائی اور حسن ہے جس سے ہماری روزمرہ کی زندگی کا دامن بھرا ہوا ہے۔ اور اس کا تعلق اس روایت سے ہے جس کا سلسلہ ناصر کاظمی اور فراق سے ہوتا ہوا ہمیں میر صاحب تک لے جاتا ہے۔

شمیم حنفی

نئی دہلی



بھاگنے کا کوئی رستہ نہیں رہنے دیتے
کوئی در کوئی دریچہ نہیں رہنے دیتے

آسماں پر سے مٹا دیتے ہیں تاروں کا سراغ
ریت پر نقش کفِ پا نہیں رہنے دیتے

کوئی تصویر مکمل نہیں ہونے پاتی
دھوپ دیتے ہیں تو سایا نہیں رہنے دیتے

پہلے بھر دیتے ہیں سامان دو عالم دل میں
پھر کسی شے کی تمنا نہیں رہنے دیتے

شہر کوراں میں بھی آئینہ فروش آتے ہیں
بے تجلی کوئی قریہ نہیں رہنے دیتے

طور سینا ہو کہ آتش کدۂ سوز نہاں
راکھ رہ جاتی ہے شعلہ نہیں رہنے دیتے

☆☆



اس کی ہر موج سے نوحوں کی صدا آتی ہے
کن خرابوں سے گزر کر یہ ہوا آتی ہے

پا شکستہ ہوئے ایسے کہ پھر اٹھا نہ گیا
گرد اڑتی ہے نہ آواز درا آتی ہے

وہ یقیں ہو کہ گماں کچھ نہیں باقی دل میں
ہاتھ اٹھتے ہیں نہ ہونٹوں پہ دعا آتی ہے

دل نہ میلا کرو سوکھا نہیں سارا جنگل
ابھی اک جھنڈ سے پانی کی صدا آتی ہے

یاد کی شاخ سے لٹکی ہے کوئی پینگ اب تک
وہی خوشبوئے حنائے کفِ پا آتی ہے





وہی شاخ نہال ہستی ہے
وہی دکھ کی دراز دستی ہے

ہوش والوں کو چشم کم سے نہ دیکھ
ہوش تو انتہائے مستی ہے

دل میں پھرتی ہے دھوپ سارا دن
رات بھر چاندنی برستی ہے

ہمہ تن گوش ہے نظر میری
تیری آواز کو ترستی ہے

کیسی ناگن ہے یہ اداسی بھی
بھری محفل میں آ کے ڈستی ہے

فکر خلق خدا نہ خوف خدا
یہ کہاں کی خدا پرستی ہے

ارے کیوں ڈر رہے ہو جنگل سے
یہ کوئی آدمی کی بستی ہے

☆☆



نالۂ خونیں سے روشن درد کی راتیں کرو
میں نہیں کہتا دعا مانگو مناجاتیں کرو

دل کے گچھے میں ہیں سارے موسموں کی چابیاں
دھوپ کھولو چاندنی چھٹکاؤ برساتیں کرو

جو نہیں سنتے ہیں ان کو بھی سناؤ اپنی بات
جو نہیں ملتے ہیں ان سے بھی ملاقاتیں کرو

موت خاموشی ہے چپ رہنے سے چپ لگ جائے گی
زندگی آواز ہے باتیں کرو باتیں کرو

☆☆



گلیوں کو چپ لگی ہے نگر بولتے نہیں
دیوار و در وہی ہیں مگر بولتے نہیں

کوّے کہاں چلے گئے چڑیوں کو کیا ہوا
جو بولتے تھے شام و سحر بولتے نہیں

تم کو خبر ہے بام حرم کے کبوترو
کیوں طائران شاخ و شجر بولتے نہیں

کے شہر لوگ نہیں
اول تو بولتے ہی نہیں
جو بولتے ہیں بار دگر
بولتے نہیں

☆☆



کیا سناؤں کوئی قصہ کوئی روداد نہیں
جیسے اک خواب سے گزرا ہوں جو اب یاد نہیں

جانے کیوں چاند ٹھہر جاتا ہے چلتے چلتے
اور اس گھر پہ جو اک عمر سے آباد نہیں

وہی آواز مسلسل کہیں مدھم کہیں تیز
لاکھ کہتے رہیں آزاد ہیں آزاد نہیں

فرق اگر ہے تو سلاخوں کی کمی بیشی کا
ہم قفس زاد ہیں سب کوئی چمن زاد نہیں

اس تغافل میں بھی ہر شے پہ نظر تھی تیری
یاد ہوگا تجھے وہ بھی جو مجھے یاد نہیں

☆☆



مل بھی گئی اگر وہ زباں کیا کروں گا میں
اس دل گرفتگی کو بیاں کیا کروں گا میں

دیکھا نہ آنکھ بھر کے جسے اس کے رو برو
اک عمر کے نہاں کو عیاں کیا کروں گا میں

کیا منہ دکھاؤں گا در دستک شناس کو
اب دیکھ کر وہ بند مکاں کیا کروں گا میں

سائے بھی اس بہار و خزاں کے گزر گئے
اب کیا ہے دیکھنے کو وہاں کیا کروں گا میں

کیوں اس کی یاد کو بھی نہ دل سے نکال دوں
جب آگ بجھ گئی تو دھواں کیا کروں گا میں

☆☆

٭

لاغر ہیں جسم رنگ ہیں کالے پڑے ہوئے
بالوں پہ گرد پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے

اس معرکے میں عشق بچارا کرے گا کیا
خود حسن کو ہیں جان کے لالے پڑے ہوئے

یہ جو بھی ہو بہار نہیں ہے جناب من
کس وہم میں ہیں دیکھنے والے پڑے ہوئے

اس دہر کی کشادہ دری پر نہ جائیے
اندر قدم قدم پہ ہیں تالے پڑے ہوئے

شیشے کے اک گلاس میں نرگس کے پھول ہیں
اک میز پر ہیں چند رسالے پڑے ہوئے





پس غبار فلک کوئی مہ جبیں ہی نہ ہو
یہ گرد باد کہیں نالۂ زمیں ہی نہ ہو

سلگنے لگتا ہے دل کیوں غروب کے ہنگام
کہیں یہ شام کوئی زلف عنبریں ہی نہ ہو

کہیں کچھ اور ہی کہتی نہ ہو زبان بدن
لب نشاط کے پیچھے دل غمیں ہی نہ ہو

مشتاقؔ شفق دامن جیسے ہو رہے سمجھ
کسی بہارِ گذشتہ کی آستیں ہی نہ ہو

☆☆



دکھ کی چیخیں پیار کی سرگوشیاں رہ جائیں گی
ہم چلے جائیں گے آوازیں یہاں رہ جائیں گی

آئنوں جیسے بدن دریا بہا لے جائے گا
ریت میں پیراہنوں کی دھجیاں رہ جائیں گی

صبح سے پہلے گزر جائے گا یہ طوفان بھی
آسماں پر اکا دکا بدلیاں رہ جائیں گی

ہو بھی جائے دل اگر خالی خیال و خواب سے
پھر بھی اک کونے میں کچھ بے خوابیاں رہ جائیں گی

☆☆



دل ناشاد کو کیوں اور بھی ناشاد کریں
وقت جو بیت گیا اب اسے کیا یاد کریں

شدت غم کا یہ ریلا بھی گزر جائے گا
دل کا جو رنگ بھی ہو گھر تو نہ برباد کریں

کچھ وہی زہر کو امرت میں بدل سکتے ہیں
جو فسردہ ہوں نہ برہم ہوں نہ فریاد کریں

سر پٹختا ہے سلاخوں سے پرند ایک سے ایک
کس کو پنجرے ہی میں رکھیں کسے آزاد کریں

ہم بھی چنتے تھے بہت گلشن دیدار سے پھول
جہاں آئینہ نظر آئے ہمیں یاد کریں

☆☆



ہم گرے ہیں جو آ کے اتنی دور
کس نے پھینکا گھما کے اتنی دور

کیسی ظالم تھی قرب کی خواہش
کہاں مارا ہے لا کے اتنی دور

اب تو اس کا خیال بھی دل نے
رکھ دیا ہے اٹھا کے اتنی دور

اب تو وہ برگ آرزو بھی ہوا
لے گئے ہے اڑا کے اتنی دور

لالہ و گل بھی اک تسلی ہے
کون آتا ہے اب کے اتنی دور

☆☆



شام ہوتی ہے تو یاد آتی ہے ساری باتیں
وہ دوپہروں کی خموشی وہ ہماری باتیں

آنکھیں کھولوں تو دکھائی نہیں دیتا کوئی
بند کرتا ہوں تو ہو جاتی ہیں جاری باتیں

کبھی اک حرف نکلتا نہیں منہ سے میرے
کبھی اک سانس میں کر جاتا ہوں ساری باتیں

جانے کس خاک میں پوشیدہ ہیں آنسو میرے
کن فضاؤں میں معلق ہیں تمہاری باتیں

کس ملاقات کی امید لیے بیٹھا ہوں
میں نے کس دن پہ اٹھا رکھی ہیں ساری باتیں

☆☆



پہلے نہال غم سے شناسائی کیجیے
پھر شاخ زمزمہ پیرائی کیجیے

ہر رت کا اپنا رنگ ہے اپنی مٹھاس ہے
جو رت بھی آئے اس کی پذیرائی کیجیے

فانی تو ہے جہان مگر سخت جان ہے
ضائع نہ اس پہ اپنی توانائی کیجیے

اس ریگ زار تن کا بکھرنا ہے ناگزیر
چاہے ہزار کوشش یک جائی کیجیے

رہنے لگا ہے شور بہت دل کے آس پاس
اب کیسے اس نواح میں تنہائی کیجیے

☆☆



آج رو کر تو دکھائے کوئی ایسا رونا
یاد کر اے دل خاموش وہ اپنا رونا

رقص کرنا کبھی خوابوں کے شبستانوں میں
کبھی یادوں کے ستونوں سے لپٹنا رونا

تجھ سے سیکھے کوئی رونے کا سلیقہ اے ابر
کہیں قطرہ نہ گرانا کہیں دریا رونا

رسم دنیا بھی وہی راہ تمنا بھی وہی
وہی مل بیٹھ کے ہنسنا وہی تنہا رونا

یہ ترا طور سمجھ میں نہیں آیا مشتاقؔ
کبھی ہنستے چلے جانا کبھی اتنا رونا





اک عمر کی اور ضرورت ہے وہی شام و سحر کرنے کے لیے
وہ بات جو تم سے کہہ نہ سکے اسے بار دگر کرنے کے لیے

کبھی ذکر کیا تیری زلفوں کا اور جاتی شام کو روک لیا
کبھی یاد کیا ترے چہرے کو آغاز سحر کرنے کے لیے

فٹ پاتھ پہ بھی سونے نہ دیا ترے شہر کے عزت داروں نے
ہم کتنی دور سے آئے تھے اک رات بسر کرنے کے لیے

اس آنکھ نے جس کی قسمت میں سچ مچ کے در و دیوار نہ تھے
خوابوں کے نگر آباد کیے حسرت کی نظر کرنے کے لیے

اس بے حس دنیا کے آگے کسی لہر کی پیش نہیں جاتی
اب بحر کا بحر اچھال کوئی اسے زیر و زبر کرنے کے لیے





لرزہ ہوا تھا طاری حسن حسین دل پر
رکھا تھا پاؤں تم نے جب سر زمین دل پر

تم آؤ تو دکھاؤں بیدرد بارشوں نے
کھینچی ہیں جو لکیریں لوح جبین دل پر

رت آگئی خزاں کی باغات آسماں سے
جھڑنے لگے ہیں پتے خاک زمین دل پر

گزرے ہزار بادل پلکوں کے سائے سائے
اترے ہزار سورج اک شہ نشین دل پر

کل شام اک پرندہ جانے کہاں سے آیا
کچھ دیر چہچہایا شاخ حزین دل پر

☆☆



جو دل کے داغ ہیں معذور ہوں دکھانے سے
وہ اشک ہیں کہ جو بہتے نہیں بہانے سے

وہاں سلام کو آتی ہے ننگے پاؤں بہار
کھلے تھے پھول جہاں تیرے مسکرانے سے

وہی صدا تھی مگر یوں لگا کہ جیسے کوئی
پکارتا ہو کسی دوسرے زمانے سے

نہ جانے کیوں مرا جی چاہتا تھا وقت وداع
پلٹ کے پھر تجھے دیکھوں کسی بہانے سے

وہ کار عشق ہو یا کاروبار دنیا ہو
کوئی بھی کام نہ ہم نے کیا ٹھکانے سے

☆☆



اٹھ کر تری زلفوں سے گھٹا آتی رہے گی
چھو کر ترے سانسوں کو صبا آتی رہے گی

آنکھوں کو ترے عارض و لب یاد رہیں گے
دل سے ترے ہنسنے کی صدا آتی رہے گی

یادیں بھی کسی سے کبھی زنجیر ہوئی ہیں
باندھو بھی ہوا کو تو ہوا آتی رہے گی

مشتاق کوئی کان لگائے بنہ لگائے
دریا کے گزرنے کی صدا آتی رہے گی

☆☆



وطن بدلا مگر بدلے نہ حالات
وہی دنیا وہی اس کے سوالات

وہی بپھرا ہوا بکھرا ہوا دن
وہی سہمی ہوئی سمٹی ہوئی رات

وہی اڑتے ہوئے پتے ہوا میں
وہی شاخیں ہیں پھیلائے ہوئے ہات

کبھی یہ کہہ کے دیتا ہوں تسلی
سحر ہوگی بدل جائیں گے حالات

کبھی یہ سوچ کر ہنستا ہوں دل میں
کہاں جائیں گے یہ ارض و سماوات

کبھی یہ شک کہ ہوسکتا ہے اس نے
بنایا ہی نہ ہو روز مکافات

☆☆



قالین شفق بچھا ہوا تھا
کچھ رنگ ہی اور باغ کا تھا

گزری ہوئی بلبلوں کا سایہ
اک شاخ گلاب پر دھرا تھا

سبزہ ہو مراقبے میں گویا
خاموش تھا اور جھکا ہوا تھا

بیٹھا تھا کوئی مرے مقابل
اور آپ سے آپ ہنس رہا تھا

دل صبح سے مضطرب ہے میرا
یہ خواب اگر نہ تھا تو کیا تھا

☆☆




وستِ سموم وستِ صبا کیوں نہیں ہوا
درِ موسمِ بہار کا وا کیوں نہیں ہوا

ظالم تھے ماورائے حساب و کتاب کیا
ان پر نزولِ قہرِ خدا کیوں نہیں ہوا

ان کے سروں پہ کیوں نہیں ٹوٹیں قیامتیں
ان کے گھروں میں حشر بپا کیوں نہیں ہوا

گونجی نہ کیوں فلک سے کوئی آیت غضب
یہ گنبد سکوت صدا کیوں نہیں ہوا

دل میں ہیں کس امید کے پنجے گڑے ہوئے
یہ ماس ناخنوں سے جدا کیوں نہیں ہوا

☆☆



دیکھیے اہل دین کا اعجاز
موت بھی ہو گئی شریک نماز

دل سے احساس غم تو چھین لیا
اور کیا کیجیے گا بندہ نواز

از افق تا افق وہی مطرب
از سما تا سمک وہی آواز

ایسی تنہائیاں بھی گزری ہیں
یاد بھی جب نہ بن سکی دم ساز

تم نے دیکھے نہیں خزاں کے رنگ
بھول جاتے بہار کے انداز

☆☆



اس کی حسرت ہے جو بے ناز و ادا لگتا ہو
اور بھی کچھ رخ و گیسو کے سوا لگتا ہو

وہ جہاں بھی ہو اسے دور سے پہچان سکوں
سب میں شامل ہو مگر سب سے جدا لگتا ہو

اٹھ کھڑا ہو تو لگے موج شفق اٹھی ہے
چل رہا ہو تو سمندر کی ہوا لگتا ہو

دھوپ کی شال میں کندن سا دمکتا تھا وہ شخص
کیا خبر چادرِ مہتاب میں کیا لگتا ہو

مدتیں ہو گئیں دیکھا ہی نہیں اس کی طرف
اسی ڈر سے کہیں بدلا نہ ہوا لگتا ہو

☆☆

ٹوٹ گیا ہوا کا زور سیل بلا اتر گیا
سنگ و کلوخ رہ گئے لہر گئی بھنور گیا

وہ بھی عجیب دور تھا دل کا چلن ہی اور تھا
شام ہوئی تو جی اٹھا صبح ہوئی تو مر گیا

کس کے بندھے ہوئے تھے ہم دامن ماہتاب سے
ہم بھی ادھر ادھر گئے چاند جدھر جدھر گیا

کتنے رفیق و ہم سفر جن کی ملی نہ کچھ خبر
کس کے قدم اٹھے کدھر کون کہاں پہ مر گیا

بجھ گئی رونق بدن اڑ گیا رنگ پیرہن
جان امیدوار من وقت بہت گزر گیا

☆☆



کبھی خواہش نہ ہوئی انجمن آرائی کی
کوئی کرتا ہے حفاظت مری تنہائی کی

میں تو گم اپنے نشے میں تھا مجھے کیا معلوم
کس نے منہ پھیر لیا کس نے پذیرائی کی

وہ تغافل بھی نہ تھا اور توجہ بھی نہ تھی
کبھی ٹوکا نہ کبھی حوصلہ افزائی کی

ہچکیاں شام شفق تاب کی تھمتی ہی نہ تھیں
اب بھی رک رک کے صدا آتی ہے شہنائی کی

ہم سے پہلے بھی سخنور ہوئے کیسے کیسے
ہم نے بھی تھوڑی بہت قافیہ پیمائی کی

☆☆



شہر پھر یاد آئے یادوں کے
دل میں پھرتے ہیں سائے یادوں کے

اتنی بے درد بارشوں کے بعد
کس نے جنگل اگائے یادوں کے

سردیوں کی اندھیری راتوں میں
کس نے جادو جگائے یادوں کے

زندگی کی سفید چادر پر
کس نے ٹھپے لگائے یادوں کے

جن کی نس نس میں دل دھڑکتا تھا
اب وہ یادیں ہیں سائے یادوں کے

حسن بھی یاد حسن ہے کہ یہاں
کچھ نہیں ہے سوائے یادوں کے

☆☆



پھر کوئی دل میں گائے جاتا ہے
ایک ہی دھن سنائے جاتا ہے

روشنی چل رہی ہے پانی میں
کوئی شمعیں جلائے جاتا ہے

جیسے پو پھٹ رہی ہو جنگل میں
یوں کوئی مسکرائے جاتا ہے

پیچھے مڑ کر بھی دیکھتا نہیں وہ
حوصلہ بھی بڑھائے جاتا ہے

آئنہ بھی بدل کے دیکھ لیا
وہی صورت دکھائے جاتا ہے

☆☆



یہ رنگ یہ روشنی یہیں ہے
آگے کوئی سحر نہیں ہے

لگتے ہیں یہ پیڑ دیکھے بھالے
شاید وہ گلی یہیں کہیں ہے

ہے روپ مگر کسی کسی پر
ہے دھوپ مگر کہیں کہیں ہے

تو کس کو پکارتا ہے اے دل
تیرا تو یہاں کوئی نہیں ہے

آرام طلب نہیں رہے وہ
دیوار تو آج بھی وہیں ہے

☆☆



کہاں ساری اداسیاں رکھوں
کیسے اس دل کو شادماں رکھوں

ہر طرف بجلیاں چمکتی ہیں
کہاں لے جا کے آشیاں رکھوں

اسی مٹی کے گھر میں سب کچھ ہے
کیوں نظر سوئے لامکاں رکھوں

یہی چھوٹی سی چھت بہت ہے مجھے
کیوں تمنائے آسماں رکھوں

طاق دل بھی نہیں رہا محفوظ
اب تری یاد کو کہاں رکھوں

☆☆



اس جھٹپٹے میں نور تھے ہم تیرگی تھے ہم
اے کرہ زمین تری زندگی تھے ہم

روتی تھی ہم کو چشم فلک رات بھر
صبح ازل کے بچھڑے ہوئے آدمی تھے ہم

اپنی بھی دوستی تھی چراغ نشاط سے
طاق شب ملال کبھی روشنی تھے ہم

پھر کیوں فریبِ خوابِ مسرت دیا ہمیں
تو خوب جانتا ہے سدا کے دکھی تھے ہم

ہم میں خرابیاں تھیں تو کچھ خوبیاں بھی تھیں
آخر ملائکہ تو نہ تھے آدمی تھے ہم

☆☆



شعلہ نہ بن سکے شرر زندگی سے ہم
دنیا کو دیکھتے رہے افسردگی سے ہم

پھیلائیں بھی تو دامن دل سوکھتا نہیں
بھیگے تھے جانے کون سی رت کی جھڑی سے ہم

لگتا تھا کوئی ہے ابھی خالی مکان میں
باہر نکل سکے نہ کسی کی گلی سے ہم

جی پھر بھی چاہتا تھا سنے کوئی دل کی بات
گو جانتے تھے کہہ نہ سکیں گے کسی سے ہم

لازم ہے اب چمک تری زلف قدیم کی
تاریک ہو چلے ہیں نئی روشنی سے ہم

☆☆



زمیں سے اگتی ہے یا آسماں سے آتی ہے
یہ بے ارادہ اداسی کہاں سے آتی ہے

اسے نئے در و دیوار بھی نہ روک سکے
وہ اک صدا جو پرانے مکاں سے آتی ہے

بدن کی باس نسیم لباس بوئے نفس
کوئی مہک ہو اسی خاکداں سے آتی ہے

دلوں کی برف پگھلتی نہیں ہے جس کے بغیر
وہ آنچ ایک غم بے نشاں سے آتی ہے

سخن وری ہے نظر سے نظر کا ناز و نیاز
عروض سے نہ زبان و بیاں سے آتی ہے

☆☆



بھولے بسرے موسموں کے درمیاں رہتا ہوں میں
اب جہاں کوئی نہیں رہتا وہاں رہتا ہوں میں

دن ڈھلے کرتا ہوں بوڑھی ہڈیوں سے ساز باز
جب تلک شب ڈھل نہیں جاتی جواں رہتا ہوں میں

کیا خبر ان کو بھی آتا ہو کبھی میرا خیال
کن ملالوں میں ہوں کیسا ہوں کہاں رہتا ہوں میں

جگمگاتے جاگتے شہروں میں رہتا ہوں ملول
سوئی سوئی بستیوں میں شادماں رہتا ہوں میں

بوتا رہتا ہوں ہوا میں گم شدہ نغموں کے بیج
وہ سمجھتے ہیں کہ مصروفِ فغاں رہتا ہوں میں

☆☆




کس رقص جان و تن میں میرا دل نہیں رہا
گو میں کسی جلوس میں شامل نہیں رہا

ہر چند تیری روح کا محرم رہا ہوں میں
لیکن ترے بدن سے بھی غافل نہیں رہا

تجھ سے کوئی گلہ ہے نہ تیری وفا سے ہے
میں ہی ترے خیال کے قابل نہیں رہا

باہر چہک رہی ہو کہ اندر مہک رہی
دل اب کسی بہار کا قائل نہیں رہا

یارو سفینۂ غمِ دل کا بنے گا کیا
لگتا ہے اب کہیں کوئی ساحل نہیں رہا

☆☆



کچھ دن ہوا بہار کی آئی چلی گئی
کچھ دن خزاں نے خاک اڑائی چلی گئی

جانے وہ کب کی یاد تھی جانے کہاں کی تھی
آئی کسی کی شکل دکھائی چلی گئی

رہتا نشان داغ جبیں کس امید پر
اس در کے ساتھ ناصیہ سائی چلی گئی

سینے میں اب بھی ہیں کئی چھالے پڑے ہوئے
کیسے کہوں کہ آبلہ پائی چلی گئی

چاروں طرف سرودِ شبانہ کی راکھ ہے
اے دل کہاں وہ شعلہ نوائی چلی گئی

☆☆



مطمئن کیوں نہیں جہان سے ہم
چاہتے کیا ہیں آسمان سے ہم

اب ہمیں کیا خبر ہدف کیا ہے
کبھی نکلے نہیں کمان سے ہم

تھی کبھی ایک بود و باش اپنی
تھے کبھی ایک خاندان سے ہم

دل کا سب حال تھا جسے معلوم
کیا بتاتے اسے زبان سے ہم

شوق وابستگی کسے معلوم
کب اتر جائیں اس کے دھیان سے ہم

☆☆



خیال خاطر ناشاد کرتا رہتا ہوں
لب خموش سے فریاد کرتا رہتا ہوں

ہر آن گلشن تصویر کے پرندوں کو
پکڑتا رہتا ہوں آزاد کرتا رہتا ہوں

جہان تنگ دلاں کے ستم رسیدوں کو
دیار خواب میں آباد کرتا رہتا ہوں

تراشتا ہوں نئی مسجدیں خیالوں میں
نئے صنم کدے ایجاد کرتا رہتا ہوں

وہ اضطراب مسلسل نہیں رہا کہ جو تھا
اگرچہ اب بھی تجھے یاد کرتا رہتا ہوں





وا ہوئے پھر لبِ مرطوبِ خزاں آخرِ شب
دل میں کھولی کسی کونپل نے زباں آخرِ شب

بجلیاں جیسے چمکتی ہوں گھنے جنگل میں
دیدنی تھا تری یادوں کا سماں آخرِ شب

گنگناتی تھیں وہ سنسان پرانی گلیاں
باتیں کرتے تھے وہ خاموش مکاں آخرِ شب

بند ہو جاتے تھے جس گھر کے دریچے سر شام
میں کسے دیکھنے جاتا تھا وہاں آخر شب

ان ٹھکانوں کے نشانات بھی باقی نہ رہے
جمع ہوتے تھے مرے یار جہاں آخر شب

☆☆



نہ بدلے گا کبھی موسم ہمارا
رہے گا کیا یہی عالم ہمارا

سیئیں کس تار سے پوشاکِ ہستی
کوئی بخیہ نہیں محکم ہمارا

اسی پر ٹوٹتی ہے تان اپنی
وہی پنچم وہی مدھم ہمارا

کبھی جس سے بہت ملتے رہے ہیں
تعلق رہ گیا ہے کم ہمارا

مگر کب تک چلے گی یاد اس کی
کہاں تک ساتھ دے گا غم ہمارا

☆☆



دنیا طلسم رنگ و نوا تھی شباب میں
خوشبو ہی اور تھی میرے آب و تراب میں

صحن چمن گلاب کی شاخیں سفید ہاتھ
ناخن چمک رہے تھے شب ماہتاب میں

پہلے ہی کم نہ تھی لب و عارض کی روشنی
کچھ اور بے حجاب لگے وہ حجاب میں

خوابوں کی کرچیاں لیے پھرتا ہوں ساتھ
اس دل نے مجھ کو ڈال دیا کس عذاب میں

☆☆





سفر نیا تھا نہ کوئی نیا مسافر تھا
وہی طلب تھی وہی آشنا مسافر تھا

دیار درد کی پر ہول رہ گزاروں میں
ترا خیال کوئی دوسرا مسافر تھا

جو دیکھتا ہوں تو دیوار آئنہ کے ادھر
میری ہی شکل کا اک بے نوا مسافر تھا

نظر ملی تھی گھڑی بھر کو پھر ملا نہ کبھی
نہ جانے کون تھا کس دیس کا مسافر تھا





زمین پر بھی سر آسماں بھی کوئی نہیں
یہاں بھی کوئی نہیں ہے وہاں بھی کوئی نہیں

کسی کے ہاتھ بھی بند حباب تک نہ گئے
کھلا کہ محرم آب رواں بھی کوئی نہیں

چمک دمک پہ نہ جا چشم ولب کو غور سے دیکھ
غمیں نہیں تو یہاں شادماں بھی کوئی نہیں

ازالۂ سفرِ رائیگاں تو کیا ہوتا
حوالۂ سفرِ رائیگاں بھی کوئی نہیں

☆☆



چپ کہیں اور لیے پھرتی تھی باتیں کہیں اور
دن کہیں اور گزرتے تھے تو راتیں کہیں اور

یہی دنیا تھی مگر آج بھی یوں لگتا ہے
جیسے کاٹی ہوں ترے ہجر کی راتیں کہیں اور

تھوڑے بے حرف سخن دل نے بچا رکھے ہیں
جیسے کرنی ہوں کسی شخص سے باتیں کہیں اور

☆☆



بال بکھرے ہوئے سفید لباس
رات دیکھا اسے اداس اداس

وہی عالم کہ ہجر تھا نہ وصال
وہی موجودگی کہ دور نہ پاس

کہیں اک نیلگوں جزیرہ ہے
جس کے چاروں طرف ہے پیاس ہی پیاس

☆☆



ہم نے ہی کبھی کان لگائے نہیں ورنہ
یاں کون صدا ہے جو سنائی نہیں دیتی

شرمندہ ہوں امید ملاقات سحر سے
رخصت ہی مجھے شام جدائی نہیں دیتی

آنکھیں بھی وہی آئنۂ دل بھی وہی ہے
لیکن کوئی تصویر دکھائی نہیں دیتی

اس جال میں ٹوٹا ہوا حلقہ کوئی ڈھونڈو
دنیا تو کبھی اذن رہائی نہیں دیتی

☆☆



خواب رخسار یار میں گزری
زندگی انتظار میں گزری

دل کو جانا تو تھا مگر مت پوچھ
یہ خزاں کس بہار میں گزری

کوئی قدغن کسی طرف سے نہ تھی
اپنے کھینچے حصار میں گزری

☆☆



کس گھاٹ اتر گئے میری آوارگی کے دن
وہ دل کے اضطراب کی راتیں خوشی کے دن

کس دشت بے کنار کی لہروں میں کھو گئے
اے موج آرزو تری تشنہ لبی کے دن

اس دل کو اب بھی تجھ سے تعلق ہے دور کا
رہتے ہیں آس پاس تری دوستی کے دن

میں اک گلِ عجب تھا گلستانِ شوق کا
رہنِ خزاں رہے مری رامش گری کے دن

☆☆



کیسے مطلب ادا کرے کوئی
دکھ کا کیا ترجمہ کرے کوئی

ایک بے رنگ سی اِداسی ہے
ایسے موسم میں کیا کرے کوئی

لوگ پہلے ہی کون سے خوش ہیں
کیوں کسی کو خفا کرے کوئی

کھول دیتی ہے زندگی آنکھیں
لاکھ سپنے بنا کرے کوئی

☆☆



عمر بھر آس کے زنداں میں رہے
جان چھوٹی نہ ملاقات آئی

اسی چکر میں زمانے گزرے
دن چڑھا شام ہوئی رات آئی

تھوڑا سورج ہی بچا کر رکھ لو
کچھ تو نکلے گا جو برسات آئی

صبح ہوتی نہیں دیکھی ہم نے
رات گزری تھی کہ پھر رات آئی

☆☆



(شہریار کے لیے)

دل میں پھر بارشوں کا موسم ہے
روز کالی گھٹائیں آتی ہیں

ایک قطرے کو چھیڑنے کے لیے
کیسی کیسی ہوائیں آتی ہیں

دیر کے بند چائے خانوں سے
قہقہوں کی صدائیں آتی ہیں

جاں یادوں سے چھوٹتی ہی نہیں
دور تک سے بلائیں آتی ہیں

☆☆



خوش نہیں تھے ہمیں نکال کے وہ
آپ بھی آسمان چھوڑ گئے

بستیوں میں بنوں میں غاروں میں
لوگ کیا کیا نشان چھوڑ گئے

جس کا پوچھا یہی جواب ملا
وہ تو کب کے مکان چھوڑ گئے

نہ سہی خار غم خلش ہی سہی
کچھ تو وہ مہربان چھوڑ گئے

☆☆



ناخن پا نے طلسمات کے در کھول دیے
پنکھڑی دیکھ کے یاد آگیا سارا موسم

کاسنی پھول ہرے پیڑ سلگتی شاخیں
کون بادل تھا کہ برسا گیا سارا موسم

رنگ پتوں کے بدلنے لگے جھڑنے لگے پھول
دیکھتے دیکھتے مرجھا گیا سارا موسم

پھر نہ وہ شاخ سمن تھی نہ وہ جنگلہ نہ وہ شام
آن کی آن میں دھندلا گیا سارا موسم

☆☆

اشعار



سب ساحلوں کی نقش گری دیکھتے رہے
پانی پہ کیا رقم ہے کسی نے نہیں پڑھا

ریگ رواں بھی پیاس تھی آب رواں بھی پیاس
حرف سراب تشنہ لبی نے نہیں پڑھا

اب مجھ کو داد سارا زمانہ بھی دے تو کیا
جس کے لیے لکھا تھا اسی نے نہیں پڑھا

☆☆



بدن میں باغ عدن کی فضا بھی شامل ہے
اس آب و گل میں وہ آب و ہوا بھی شامل ہے

صباحت لب و عارض میں صبح بھی ہے شریک
شفق میں شوخی رنگ حنا بھی شامل ہے

یہ بوجھ کوئی اکیلا اٹھا نہیں سکتا
مرے قدم میں ترا نقش پا بھی شامل ہے

☆☆



اندھیرا سا ہوا پھر ایک دم تارے نکل آئے
یہ کن یادوں کی ٹھنڈی ریت پر سر رکھ دیا میں نے

اتارے طاق نسیاں سے کئی گزرے ہوئے موسم
پھر ان کو طاق نسیاں پر اٹھا کر رکھ دیا میں نے

بہت جی چاہتا تھا کل تری آواز سننے کو
تری آواز آئی تو ریسیور رکھ دیا میں نے

☆☆



کہا ہے دل نے کئی بار کان میں کہ چلو
ہم اس طلسم در و بام سے نکل جائیں

دل فگار یہ خار رہ محبت ہیں
یہ وہ نہیں ہیں جو آرام سے نکل جائیں

☆☆

تماشہ گاہ جہاں میں مجال دید کسے
یہی بہت ہے اگر سرسری گزر جائیں

☆☆

ملنے کی یہ کون گھڑی تھی
باہر ہجر کی رات کھڑی تھی

☆☆

کرتا رہتا ہوں اسے یاد مگر ساتھ ہی ساتھ
دل سے کہتا ہوں کہ اب یاد میں کیا رکھا ہے

☆☆

بات جاتی نہیں ہے رات کے ساتھ
زندگی بھر صدائیں آتی ہیں

☆☆

ترے جمال پہ آئے نہ کوئی آنچ کبھی
ترا بدن کبھی آزردۂ گزند نہ ہو
بس ایک حسرت دیدار گل ہے آنکھوں میں
در بہار دل بے نوا پہ بند نہ ہو

☆☆

اس گل سرخ تمنا کو کہاں سے لاؤں
جو میری روح کے جنگل میں چراغاں کر دے

☆☆

زمین پر تھے تو سر آسماں سے لگتا تھا
ذرا اٹھے جو زمیں سے تو نقش پا ہوئے ہم

☆☆

چھت سے کچھ قہقہے ابھی تک
جالوں کی طرح لٹک رہے ہیں

☆☆

اشک تو کب کے ہوئے خشک مگر چشم خیال
آج بھی حسرت دیدار سے نم رہتی ہے

☆☆

عمر بھر دکھ سہتے سہتے آخر اتنا تو ہوا
اپنی چپ کو دیکھ لیتا ہوں صدا بنتے ہوئے

☆☆

غم کی مجلس میں بھی لازم نہیں سب کا رونا
نہیں روتے ہمیں اچھا نہیں لگتا رونا

☆☆

تیرے گھر کا پتہ ہے یاد اب تک
جھنڈ تھے کچھ وہاں درختوں کے

☆☆

یہ فکر تھی پہلے کہ سفر کیسے کٹے گا
اب سوچ رہے ہیں کہ بہت تیز چلے ہم

☆☆

سخن ساز خاموش رہنا بھی سیکھ
خموشی بھی اک طرزِ اظہار ہے

☆☆

نظمیں



خاموش کھڑی ہے اک عمارت
چو گرد ہیں خار دار تاریں
پہرے پہ ہے فوجیوں کا دستہ
آنگن میں گھنی ہے اس قدر گھاس
ملتا نہیں جگنوؤں کو رستہ

شاخوں کی طرف پلٹ رہے ہیں
بکھرے ہوئے پھول چاندنی میں
پودوں پہ جھکی ہے ایک لڑکی
خوابوں کی ملول چاندنی میں
قینچی سے گلاب کاٹتی ہے

☆☆



گھاس پر تتلیاں
ٹوٹے ہوئے پتوں کی طرح بکھری ہیں



تراجم

کہیں سے لا نفس عندلیب کا دامن
دم صبا سے تو روشن ہوئی نہ آتش گل
(ظہوری، فارسی سے)

حیرت پہ مرتسم نہ ہوا نقش حسن یار
چشم امید اور ہے آئینہ اور ہے
(بیدل، فارسی سے)

دل پہ یاد خم ابرو نے ہے مارا ناخن
موج ہے بہر جگر کاوئ دریا ناخن

(بیدل، فارسی سے)

پوچھے جو دوستوں کا صبا آ کے نو بہار
کہنا وہ گل تو سب خس و خاشاک ہو گئے

(امیر خسرو، فارسی سے)

ہر پھول کے بدن سے دیکھا لہو ٹپکتا
یارب کہاں کے کانٹے ٹوٹے دل چمن میں

(بیدل، فارسی سے)

وقت اک دیدۂ بے پایاں ہے جس کے اندر
عکس کی طرح ہم آتے ہیں چلے جاتے ہیں

(اوکتاویو پاز، انگریزی سے)

سب کا ماتم میں نے کیا اور سب کو میں نے دفنایا
میرا ماتم کون کرے گا کون مجھے دفنائے گا

(اینا احمتووا، انگریزی سے)



Auraaq-e-Khezani

Ahmad Mushtaq



Rekhta Foundation
B-37 Sec-1 Noida-201 301
rekhtabooks@rekhta.org

